حدیث پاک کی حیثیت عقل ونقل کے تناظر میں

تحریر: حافظ عبدالمتین راشد: الریاض

بسم اللہ الرحمن الرحیم ،والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وآلہ وبعد ؛

جدہ سعودی عرب سے اردو روز نامہ ''اردو نیوز'' کے ہفتہ وار اسلامی ایڈیشن ''روشنی'' میں گزشتہ سال یکم مئی 2009، میں ایک مضمون محترم ڈاکٹر افتخار برنی صاحب کی طرف سے مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اصل موضوع مولانا امین احسن اصلاحی کے مشن سے متعلق ہے۔ جس میں چند اعتراضات کا جواب دینا، یا بطور خاص انہیں ایک تہمت سے بری کرنا تھا جسے آپ نے ڈاکٹر سید سعید عابدی کی کلام سے محسوس کیا۔ آپ نے یہ عنوان قائم کیا ہے:

حدیث پاک کی حیثیت دو انتہاؤں کے درمیان: آپ نے بتایا کہ تفریط کی انتہاء سے منکرین حدیث مراد ہیں، جو احادیث کو محض تاریخی روایات کا مقام دیتے ہیں، شرعی حکموں کا باقاعدہ مصدر تسلیم نہیں کرتے۔ دوسری انتہائے اِفراط سے صوفیہ اور قبوری مراد ہیں جو صرف قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موقع دیکھ کر عمل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ خواہ حدیث ضعیف یا موضوع ہو۔ جبکہ مولانا اصلاحی صاحب کا ان دو انتہاؤں سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔

دو انتہاؤں کا مطلب یہ ہے کہ شرعی دلائل نے حدیث پاک کو ایک حیثیت دی ہے جسے تسلیم کرنے میں لوگ ایک جیسے نہیں۔ کچھ لوگ حدیث کا یہ مقام بڑھا دیتے ہیں حتی کہ غلو میں چلے جاتے ہیں۔ جیسے صوفیہ وغیرہ، کچھ یہ مقام گھٹا دیتے ہیں حتی کہ نفی میں زیرو تک آ جاتے ہیں۔ جیسے منکرین حدیث کا گروہ ہے۔ اور کچھ لوگ بیچوں بیچ مختلف حالتوں میں ہوتے ہیں جیسے امام فراہی کے گروپ سے اصلاحی صاحب قابل ذکر ہیں جو حدیث کے مقام کو کم اہمیت دے رہے ہیں. جیسا کہ آپ نے لکھا:

''(یہ لوگ) بعض اوقات توازن کی کمی کا شکار نظر آتے ہیں، ان کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ پاسبان عقل کے غیر ضروری دباؤ میں آ جاتے ہیں، ان حضرات نے بعض ایسی احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا جو ان کے عقلی

معیار اور سائنسی توجیہات کے مطابق نہیں تھیں۔'' (روشنی یکم مئی 2009)

اسی طرح بظاہر آپ کے نزدیک سید عابدی بھی حق کے مقام سے ہٹ گئے ہیں گویا آپ کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو حدیث کو اس کے مقام سے بڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے حدیث کی حیثیت بیان کرتے ہوئے (یا مولانا اصلاحی کا دفاع کرتے ہوئے) کچھ توجیہات پیش کی ہیں جہاں محدثین کی نقطہ نظر سے مختلف ہوئے، اور یہ اختلاف کرنا حدیث کی شان عظیمی اور جلالت رتبی کے منافی ہے مثلاً چار مقامات قابل ملاحظہ ہیں:

۱)۔ حدیث کی صحت معلوم کرنے کے بعد درایت کا موقع رہتا ہے جہاں اہل حدیث اور شافعیہ صرف سند کو اہمیت دیتے ہیں۔

۲)۔ سنت سے مراد امت کا عملی تواتر یا خلفائے راشدین کا تعامل ہے۔ جسے (بہ تعبیر خاص کے) حدیث پر ترجیح دی جائے گی۔

۳)۔ حفاظتی معیار میں قرآن وحدیث کا آپس میں فرق ظاہر کرنا کہ یہ دونوں آپس میں برابر نہیں۔

۴)۔ خبر واحد کی حجیت میں صحابی کا غیر صحابی سے قیاساً فرق کرنا کیونکہ دونوں کی حیثیت مختلف ہونے سے حکم مختلف ہوگا۔

پہلا قول شروع سے معروف ہے۔ دوسرا موقف شاید اصلاحی صاحب کا اپنا مذہب ہے۔ تیسرا قول ڈاکٹر برنی صاحب کا تجویز کردہ ہے۔ چوتھا اختلاف پرانا ہے۔ مگر یہ فرق ظاہر کرنا ابھی معلوم ہوا۔ ہم ان نظریات کو شرعی دلائل کے جائزہ سے پیش کریں گے تاکہ پتہ چل سکے عقل ونقل کے تعارض میں صحیح منہج کون سا ہوسکتا ہے۔ ان شاء اللہ

عنوان کا مطلب اور موضوعی خاکہ: شرعی علم کیا ہے؟ جو کتاب وسنت سے حاصل ہو۔

مگر اشکال پیدا ہوگا۔ علم کے ذرائع تین بیان کیے جاتے ہیں، خبر، عقل اور حس (تجربات اور مشاہدات وغیرہ) اب کتاب وسنت کا علم خبری علم ہے، کیونکہ وحی پر مبنی ہے (جو کہ خبر ہے) تو باقی دو ذرائع کی نفی کیوں کی جاتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ شرعی علم کا زیادہ تعلق آخرت سے ہے۔ جہاں حس کا کام دینا محال ہے، عقل عاجز اور کمزور ہے، تاہم شریعت نے دونوں کا اعتبار کیا ہے، مثلاً آپ کوئی حسی علم، شریعت کے خلاف نہ پائیں گے، اسی طرح عقل سلیم (شبہات سے پاک عقل) بھی ضرور قبول کرے گی، مگر اس پر عقل سقیم (بیمار) کا وہم یا دھوکہ یوں سمجھیں

کہ دنیا حقیقتوں کا گھر ہے، اور جب انسانی ذہن (دماغی نسوں سے) کسی حقیقت کو تلاش کرتا ہے تو اسے کچھ پکڑنے کا موقع ملتا ہے (جسے ادراک کہا جاتا ہے)۔ بعض ادراک فائدہ دیتے ہیں، دنیا میں کام آتے ہیں اسے (حقیقت) کہا جاتا ہے، بعض کا تعلق وقتی فائدہ ظاہر ہوتا ہے پھر الٹا نقصان ظاہر کرتے ہیں، یہ (دھوکہ، وہم، خیال اور باطل) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دل یا دماغ میں ایک نور رکھا ہے جو چیزوں کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے، یہ (عقل) ہے۔ جب عقل ادراک کرتی ہے تو حقیقت اور وہم دونوں کو جمع کر لیتی ہے، اس موقع پر یہ بات پاس ہو چکی ہے، مسلم (طے شدہ) اصول ہے کہ قرآن وسنت سے فیصلہ کروایا جائے۔ (تاکہ عقل سلیم اور سقیم کا فرق معلوم ہو سکے)۔

اسی قاعدہ پر ہم کہتے ہیں شریعت عقل کے ذریعہ کو باطل نہیں کہتی، مگر عقل کو وہم ہو جاتا ہے لہذا جب ٹکراؤ پیدا کرے تو کتاب وسنت پر پیش کرو، اور اپنے اصول کا ساتھ دو۔

عنوان کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ کتاب وسنت کے علم کے پاسبان ہوئے، وہ کتاب وسنت کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے حدیث پاک کو ایک حیثیت دیتے ہیں کہ اسے اسی جگہ پر رکھا جائے، (نہیں تو عقل ورائے کی پیروی گمراہ کر دے گی) جیسے علم حدیث رکھنے والے محدثین ہوئے۔ اسی طرح جنہوں نے عقل کی معلومات کے ساتھ لمبا عرصہ گزارا حتیٰ کہ عام لوگوں سے بڑھ گئے وہ اہل عقل ہیں۔

اب جب ان کا تعارض ہوگا تو کچھ اصول ہیں جو دونوں مانتے ہیں، مگر جہاں یہ اختلاف کریں تب کس کی بات حق پر ہو سکتی ہے؟ کون شرعی حکموں کے مطابق ہو سکتا ہے؟ یہ آپ فیصلہ کریں گے۔

بنیادی طور پر کچھ اصول ہیں جو کتاب وسنت کے علماء آپس میں قبول کرتے ہیں، اور اختلاف نہیں رکھتے، تو اس موقع پر ظاہر ہے علمائے شریعت کے مقابلہ میں فلاسفہ، مناطقہ یا اہل کلام کی کچھ حیثیت نہیں رہ جاتی... چنانچہ پہلے ایک اصولی بحث برنی صاحب کر چکے ہیں اب میں پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ کن اصولوں کی بنا پر ہم حدیث کو اپنی حیثیت پر قائم رکھ سکتے ہیں، جس میں آپ علمائے حدیث کا منہج سمجھنے کی کوشش کریں۔

چنانچہ عنوان کا یہی مطلب ہے کہ جب عقل ونقل کے درمیان تعارض محسوس کریں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے تاکہ حدیث کو وہ جگہ دے سکیں جو اس کے لئے شرعی طور پر مطلوب ہے۔ یہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ حل اہل کلام کے پاس نہیں، اہل حدیث کے پاس ہے، کیونکہ حدیث انہی کا میدان عمل ہے۔ جاننا چاہیے کہ کوشش کے بعد جو کسی کو حق وصواب نظر آئے وہ اس پر اللہ کے ہاں کامیاب ہے، خواہ فیصلہ کرنے میں غلطی لگے کیونکہ اس نے

سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ سمجھ اور کوشش کے مطابق حساب لیں گے۔

موضوع کا پس منظر: (جہاں سے بات شروع ہوئی، وہ کیا ہے؟): طرف راجح کے ادراک کو علم کہا جاتا ہے جیسے قرآن میں ہے... عموماً یقینی ادراک کو علم کہا جاتا ہے (علم سے مراد نفس کا کلی حقائق میں سے ایسی حقیقت کے ساتھ معلق ہو جانا جس پر اسے نقیض- آج کی بات کا کل کو بدل جانا- کا احتمال نہ رہے) علم ہی بنیاد ٹھہرتا ہے جس پر لوگ عمل کرنا شروع کر سکتے ہیں مثلاً آپ کسی قوم کے پاس گئے اور خبر کو ایسے قرائن سے پیش کیا جس سے ان کی تسلی ہو سکے تو وہ عمل کریں گے۔ یہ علم ہے اور اگر عمل نہ کریں تو یہ خبر ہے (علم نہیں ہے)۔ محدثین کا کہنا ہے کہ خبر واحد علم کا فائدہ دیتی ہے، تبھی خبر واحد پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں خبر واحد عام خبر واحد نہیں بلکہ محتف بالقرائن (قرائن کی حامل) ہوتی ہے اور ہر قرینہ ظن کا فائدہ دیتا ہے جن کے ملنے سے وہ مجموعی طور پر علم کا فائدہ دیتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث کی ہر بات کو شرعی دلیل سمجھا جاتا ہے، اگر ظن کا فائدہ دیتی ہو تو اسے دلیل کہنے کی بجائے امارت (رہنمائی کا نشان) کہنا چاہیے جیسا کہ فن کا تقاضا ہے۔ اب محدثین کی یہ بات عقل بھی تسلیم کرتی ہے، اسی وجہ سے لوگ ان کے ساتھ ہیں، کہ جب خبر کے ساتھ کچھ قرائن بھی مل گئے جس سے نفس کے لئے حقیقت پہنچانتے ہوئے نقیض کا احتمال یا خدشہ نہ رہے تو اسے علم کے فائدے پر مان لینا چاہیے... مگر اہل کلام نہیں مانتے۔

دوسری بات: محدثین علم کا لفظ بول کر ظن غالب بھی مراد لیتے ہیں اور یقین بھی۔ ان کے نزدیک علم عام ہے خواہ اس سے ظن غالب کا فائدہ لیا جائے یا یقین کا (الوسیط ص ۴۱) بعض متکلمین علمائے اصول (کرابیسی، قفال اور سرخسی وغیرہ) محدثین کے اس موقف کی تائید کرتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے جو بات یقین کا فائدہ دے اسے علم کہیں اور جو یقین کا فائدہ نہ دے وہ علم نہیں بلکہ ظن غالب کو بھی علم کہا جاتا ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا "فان علمتموھن مؤمنات" (الممتحنة ۱۰) کہ اگر تم انہیں مومن عورتیں جان لو، یعنی حسب ظاہر ظن غالب (غلبہ گمان کے تحت) سمجھ جاؤ کہ مومن ہیں (کیونکہ کسی کو علم یقین سے جاننا ممکن نہیں ہوتا...) یہی علم پھر بعد میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین تک بڑھتا ہے (دیکھئے تفسیر سعدی الحاقۃ: ۵۱) چنانچہ علم کے یہ شرعی مراتب ان تمام مسائل کا حل ہیں جس میں اہل کلام فلاسفہ وغیرہ الجھتے ہیں مثلاً سُمنیہ اور ہندو براہمہ کہتے ہیں کہ علم صرف وہ ہے جو محسوس ہو سکے (پکڑنے، ٹٹولنے اور سونگھنے سے معلوم ہو سکے، ورنہ وہ علم نہیں، خبر ہے) اس پر دیگر اہل کلام

اعتراض کرتے ہیں کہ اگر علم کو اتنا محدود کر دو گے تو یہ فطرت اور اقوام بشر کے تعامل کے خلاف ایک ردی اور شاذ بات ہوگی... مگر شریعت نے حل پیش کیا کہ دراصل دونوں کی بات اپنی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ علم، یقین یا۔ شرعاً۔ ظن غالب سے شروع ہوتا ہے اور ''یہ علم محسوس'' اس کا آخری درجہ ہے جسے حق الیقین کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ غالب گمان کو علم کہنا صحیح ہے، اب محدثین کے نزدیک ہر خبر واحد کو یقین کا فائدہ رکھنے والی کہنا بھی صحیح ہے اور جسے وہ ظن غالب کا فائدہ دینے والے کہیں اس پر عمل کرنا بھی صحیح ہوگا، کیونکہ وہ بھی علم ہے۔ (خوب سمجھ لیجئے) اہل کلام نے محدثین سے اختلاف کیا اور کہا کہ خبر واحد کا فائدہ ظن ہے (گویا علم نہیں) اس پر محدثین نے کہا: شرعی حکموں کے مطابق خبر واحد کا فائدہ علم ہے (جس پر عمل کرنا واجب ہے ورنہ آپ سے کل قیامت کے دن سوال کیا جائے گا)۔ اہل کلام نے کہا وہ کیسے؟

جواب دیا کہ ہمارے راوی خاص قسم کے قابل اعتماد ہیں، جن کے تقویٰ، دیانت اور امانت پر شک نہیں رہتا صرف انہیں اختیار کرتے ہیں، اور یہ بات عقل بھی تسلیم کرتی ہے کہ جب ان کی ذات پر شک نہیں تو ان کی خبر پر بھی شک نہ کیا جائے۔ چنانچہ مخالفین نے زور لگایا وہ ذاتوں پر عیب ظاہر نہ کر سکے... ہم کہتے ہیں جب وہ اپنے شعبہ کے ماہر ہیں، اور انسانی طبیعت میں یہ میلان رکھا گیا ہے وہ کسی بھی شعبہ میں اس کے متعلقہ ذمہ داروں سے سوال کرتے اور اشکال دور کرتے ہیں، اب جہاں تم عیب ظاہر کر سکے وہاں ان کی بات نہ مانو، لیکن جہاں عیب نہ نکل سکے وہاں اہل شان کی بات مانو اور اس جگہ اپنا عقلی اصول چھوڑ دو۔

مثلاً محدثین کے پاس دو ذریعے ہیں (خبر متواتر): ایک بات کہہ کر گذر جائے، پھر اس کے بعد دوسرا کوئی آئے وہ بھی اس بات کو پیش کرے حتیٰ کہ اتنے ہو جائیں کہ آپ سمجھیں یہ سب مختلف جہات سے آنے والے کوئی غلط بات یا جھوٹ کا پروگرام بنا کر نہیں کہہ سکتے تھے۔ اتنا عدد جب ہر طبقہ میں پایا جائے تو اسے خبر متواتر کہتے ہیں، اگر اتنا عدد نہ ہو سکے تو (خبر واحد) کہتے ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسے خبر آحادی کہا جائے، تاہم زیادہ مشہور خبر واحد کہنا ہے۔ چنانچہ بعض اہل کلام جنہوں نے محدثین کا ساتھ دیا کہا: ہم خبر متواتر میں مانتے ہیں کہ علم یقین پیدا کرتی ہے۔ کیا مطلب واقعی رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا ہے، رہی خبر واحد تو وہ صرف ظن کا فائدہ دیتی ہے، کیا مطلب کہ ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے یوں فرمایا یا ہو سکتا ہے کوئی اور بات کہی ہو (ظن کا معنی: دو برابر کے ممکن احتمال میں سے: جسے نفس زیادہ قبول کرے مگر تردد باقی رکھے) محدثین

اسے اہل کلام کی بدعت کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس عام راوی نہیں پھر دیگر قرائن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کم از کم یہ تسلیم کرو کہ جب خبر واحد صحیح ہو تو اس کا فائدہ ظن غالب یا علم ہے۔ ورنہ عام محدثین یہ کہتے ہیں کہ خبر واحد پر اگر اتفاق ہو جائے (بالاتفاق صحیح کہہ دی جائے) تو وہ یقین پیدا کرتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ محدثین خبر واحد کا مقام یقین یا ظن غالب بتاتے ہیں، جبکہ اہل کلام اور ان کی پیروی کرنے والے چند اصولی حضرات عام ظن کا اعتبار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ تمام اہل سنت، سلف اور ائمہ سے ہٹ گئے، اور اگر ان کی بات مان لی جائے تو شریعت تردد کا نام رہ جاتا ہے کیونکہ امام ابن حبان، حازمی اور ابن الصلاح کہتے ہیں ساری شریعت خبر واحد پر ہے۔ (خبر متواتر کی نفی کرتے ہیں اور محققین نے کہا کہ ان محدثین کی بات لفظی خبر متواتر کے مطابق درست ہے)۔ مثلاً برنی صاحب جو بتا رہے تھے کہ شریعت کی بنیاد صرف خبر واحد پر کہنا غلط ہے، خبر متواتر بھی دین کا حصہ ہے تو اس کی مثال د. ابو محمد شہبہ نے صرف چار خبروں کی صورت پر دی ہے، باقی سب معنوی متواتر خبریں یا آحادی خبریں ہیں لہذا عابدی صاحب کی بات وزن رکھتی ہے۔

فرض کیا ہم اہل کلام کی بات مان لیتے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ اتنے پر راضی نہیں ہوتے جب تک قرآن کو بھی ظنی نہ کہیں (نعوذ باللہ)

پس ساری شریعت من کل الوجوہ ظنی ہوئی، یا کم از کم اہل سنت کے علماء قرآن کے حق میں اگر نہ مانیں کہ یہ بات اجماع کے خلاف ہے، تو انہیں خبر واحد پر ماننا ہوگا، جس کا معنی یہ ہے کہ ہمارا عمل منافقوں جیسا ہے، کیونکہ شک پر عمل کرنا منافقوں کی پہچان ہے، مثلاً فرمایا" فهم في ريبهم يترددون" کہ منافق اپنے شک میں الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں، جبکہ اہل ایمان کے بارہ میں فرمایا کہ سچے اور حقیقی مومن صرف وہی ہیں جو اللہ اور رسول ﷺ کی باتوں کو دل کی تصدیق سے مانیں اور پھر کسی قسم کا شک نہ رکھیں (الحجرات: ۱۵)

بتایئے اہل کلام کی بات ماننے پر کس قدر عظیم فتنہ پیدا ہو سکتا ہے، یہی ہماری دعوت ہے کہ لوگو! اصل دین پہچانو، یہ عقلی ذرائع سب کتاب وسنت کے خادم اور تابع ہیں... جب آپ یہ اختلافی خاکہ سمجھ جائیں گے تو اگلی باتوں کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

سلفی منہج: بالعموم محدثین کے منہج کو بنیاد پرستی، دقیانوسی، یا قدامت پسندی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک اعتبار سے درست ہے کیونکہ یہ اپنی بات کو قال اللہ وقال الرسول یا اس کے موافق کسی قول سلف کی طرف لوٹاتے ہیں۔ یوں

ہی اگر جدید فکر پیش کرنا ہو تو ایسے شواہد تلاش کیے جاتے ہیں جو معمولات سلف سے اجنبی نہ ہوں۔ مگر مطلقاً صحیح نہیں کیونکہ یہ دلیل کی بنا پر سلف سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ مذہب محدثات الکلام اور دیگر عملی بدعات کے مقابلے میں آتا ہے جہاں یہ عقل کو چھوڑ کر ظاہر حدیث یا قرآن کو لیتے ہیں۔ جس بنا پر انھیں ظاہری کہا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب معقولات کی بالکلیہ مخالفت نہیں بلکہ جس طرح امام ابن الصلاح (مشہور محدث م 642) کے فتاوی میں موجود ہے کہ علم کلام صحابہ و تابعین کے زمانہ میں موجود تھا۔ کسی کو اختلاف نہ تھا۔ نہ ہی وہ یونانی کتب کے موجود رہنے پر انکار کرتے تھے۔ اختلاف تب شروع ہوا تھا جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہ علوم اب کتاب وسنت سے خلط ملط ہو جائیں گے... اسی طرح بہت سے محدثین بیک وقت محدث اور اہل تعلیل بھی ہوئے... پس اس منہج کو مجرد ظاہری یا حشوی باور کرانا صحیح نہ ہوگا۔ ہاں بعض لقب پوری مطابقت رکھتے ہیں مثلاً اہل النبی، اہل الحدیث وغیرہ... سو یہ سلفی حقیقت ہے جو فرقہ نہیں، اصل ہیں۔

موضوع کا مرکزی تعلق: بات کا مرکزی تعلق مولانا اصلاحی کی اس فکر سے ہے کہ: ''سنت کی بنیاد احادیث پر نہیں۔ جس میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ بلکہ امت کے عملی تواتر پر ہے۔ امت کے عملی تواتر سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا عمل ہے۔ کیونکہ دین کا مرکز یہی گروہ ہے..... مراسم عبودیت کی ساری شکلیں صحیح احادیث سے بھی ثابت ہوتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ امت کا عملی تواتر، وہ اصل مظہر یا فینومینن (ظاہری حالت) ہے جو ہماری عبادات کو یقین کا عظیم درجہ عطا کرتا ہے''۔ (روشنی شمارہ 8 مئی 2009) بظاہر یہ عمدہ توجیہ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی اعتراض کرے کہ اگر حدیث ظنی ہے۔ جس میں سچ جھوٹ کا احتمال باقی ہے۔ تو آپ احتمالات پر عمل کی بنیاد کیوں رکھتے ہیں؟ تو اصلاحی صاحب کا مطلب یہ ہے دراصل ہم اس کے ساتھ امت کے عملی تواتر کو دیکھتے ہیں جو صحابہ اور ائمہ اسلام کی رہنمائی میں شروع سے چلتا آرہا ہے۔ تو یہ بات ہمارے عملوں کو یقین کا درجہ دیتی ہے..... میں کہتا ہوں اس نظریہ کے تحت اگر موافقت کے مسائل لیے جائیں تو شاید امت کو کوئی دوسرا نعم البدل نہ ملے مگر وہی جو اصلاحی صاحب نے پیش کیا ہے۔ تاہم منہجی فرق اختلافی مسائل سے شروع ہوتا ہے اور ہماری بحث کا تعلق اختلافی مسائل سے ہے، جہاں حدیث کو چھوڑ کر آراء کو اختیار کرنے سے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا۔ چنانچہ اختلافی اعمال کے لئے یقین کی بنیاد حاصل کرنے کے لئے تعامل امت کو دیکھنا صحیح نہ ہوگا، جیسا کہ بگاڑ کی وضاحت آرہی ہے۔

دوسرا رخ: یہ بات کہنا کہ ''احادیث سچ اور جھوٹ کا احتمال رکھتی ہیں'' صرف اہل کلام اور چند اصولیوں کا قول ہے جو جماہیر امت سے بالکل مختلف ہے جہاں اگر اہل کلام کی پوری بات مانی جائے تو وہ قرآن کو بھی ظنی سمجھتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ اگر اس موقع پر شرعی حکم کا رجوع کریں تو شیخ البانی وغیرہ کہتے ہیں کہ خبر واحد یقین کا فائدہ دیتی ہے جب اس کی صحت پر محدثین کا اختلاف نہ پایا جاتا ہو... اور اس مذہب کے حق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ محدثین کا معیار عام خبر واحد سے کہیں بلند تر ہے، جس کے متعدد معیار ہیں۔

۱۔ محدثین کی حد درجہ احتیاط کا اعتبار: جہاں وہ راوی کے راوی چھوڑے جاتے ہیں تا کہ حدیث رسول ﷺ میں جھوٹ، وہم یا دھوکے کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ رہے جس کی مثال دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے کیونکہ ان کی جہود کے بعد بشری طاقتیں جواب دے جاتی ہیں۔

۲۔ قرائن کا اعتبار: مثلاً کسی حدیث کا علمائے شان سے پاس ہو جانا، یا متفق علیہ ہونا، یا ائمہ شان سے مسلسل مروی ہونا، یا امت سے مسلسل عمل کی بنا پر اسے تلقی بالقبول کا درجہ حاصل ہونا، یا دیگر قرائن۔

۳۔ سب سے بڑھ کر یہ اعتبار کہ حدیث حفاظت، حجیت یا حکم کے استدلال میں قرآن سے مختلف نہیں، جس لحاظ سے حدیث خود قرآن ہے (حکموں کی آئینہ دار ہے) مثلاً اگر اس موقع پر اصلاحی صاحب یہ کہتے کہ واقعی احادیث کا ذریعہ پہچان تو ظنی ہے مگر قرآن کے ساتھ اس کا تعلق اتنا گہرا، عمیق، مستحکم اور کڑا ہے کہ ایک کا فائدہ دوسرے کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ تو استدلالی نقطہ نظر میں دونوں ایک حقیقت پر ہیں۔ فرق صرف اصل اور شرح کا یا دستور اور اس کے بیان کا ہے۔ چنانچہ اس پہچان میں قرآن و حدیث دونوں آپس کے مجموعی اعتبار پر ایک قوت بن جاتے ہیں جہاں حدیث ہمیں عمل یا اعتقاد کے لیے یقین کی بنیاد فراہم کر دیتی ہے...

اصلاحی صاحب کا موقف اس موقع پر الٹ ہو جاتا ہے، گویا آپ نے کہا امت کا عملی تواتر حدیث کو یقینی بنا دیتا ہے، حالانکہ اس سے فساد لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ کہتے حدیث کو وارد ہونے میں ظنی کہہ سکتے ہیں مگر ان اعتبارات کی موجودگی میں یقینی ہو جاتی ہے... تو آپ کی بات شرعی فیصلہ ہوتا جو امام احمد سے ایک روایت ہے: خبر واحد اگر عادل کی ہو، اور وہ صحیح ہو تو قطعی علم کا فائدہ رکھتی ہے۔ اہل ظاہر، محدثین اور حارث محاسبی کا یہی اختیار ہے اور اس کے مطابق حنفیہ کی دو رائے ہیں:

۱)۔ نظر واستدلال میں علم یقین پیدا کرتی ہے جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے کہا۔

۲)۔ علم طمانینت پیدا کرتی ہے جیسا کہ عیسی بن ابان اور امام سرخسی کی وضاحت ہے۔

مزید امام ابن القیم نے خبر واحد کا یہ فائدہ امام مالک، شافعی، امام ابوحنیفہ کے اصحاب، اہل ظاہر، حسین کرابیسی کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔(دیکھئے مثلا خبر الواحد و حجیتہ دکتور احمد شنتیطی ص 146)

مجموعی لحاظ سے محدثین کے مذاہب کل تین ہے۔

(۱) خبر واحد ظن غالب کا فائدہ دیتی ہیں (دیکھئے الحدیث حجة بنفسه ص۱۸) جسے اکثر کا قول کہا گیا۔ یہ امام نووی کا اختیار ہے مگر یہ قول ضعیف ہے، ائمہ محدثین نے اس کا رد کیا ہے۔(دیکھئے تدریب الراوی ۱/۱۴۳)

(۲) دوسرا قول تفصیل پر ہے کہ خبر واحد قرائن کی کثرت یا قلت سے ظن غالب سے یقین تک کا فائدہ دیتی ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ خبر واحد کا اکثر عدد یقین کا فائدہ رکھتا ہے اور کچھ حصہ ظن غالب کا۔(دیکھئے وہی الحدیث حجة ص ٦٢) تمام محدثین اور عام سلف اور مذاہب اربعہ سے نصوص اسی پر ہیں۔

(۳) تیسرا قول فرق کا ہے کہ جس کی صحت پر کسی محدث کا اختلاف نہیں وہ (خبر واحد) یقین کا فائدہ دیتی ہے اور جس جگہ محدثین کا آپس میں اختلاف ہو وہاں خبر واحد کا فائدہ ظن غالب لیا جائے گا (اگر کوئی صحیح والے قول کو ترجیحاً اختیار کرے) (یہ شیخ البانی کی طرف سے، محمد عید العباسی کا نقل کردہ مذہب ہے۔ جسے آپ نے امام خطیب کی طرف بھی منسوب کیا ہے، میں کہتا ہوں ابن طاہر مقدسی کا بھی یہی قول ہے (دیکھئے الحدیث حجة ص۱۸ اور تدریب الراوی ۱/۱٤۳)

سو یہ محدثین کے مذاہب کی تفصیل ہے جس میں پوری امت جمع ہوتی ہے (ماسوائے اہل کلام اور چند اصولیوں) کہ خبر واحد کا فائدہ کم از کم ظن غالب ہے، یعنی علم کا فائدہ دیتی ہے، جو عمل واجب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے حافظ کہتے ہیں "اتفقوا علی وجوب العمل بکل ما صح" محدثین کا اتفاق ہے کہ ہر صحیح حدیث پر عمل کرنا واجب ہے، خواہ بخاری مسلم میں نہ ہو (نزهة النظر)

چنانچہ اس شرعی حکم کو مان لینے سے تمام شرعی دلائل جمع ہو جاتے ہیں جھگڑے ختم ہونگے۔ تعارض رفع ہوگا اور وہ فساد بھی لازم نہ آئے گا جس کا ذکر خود ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ کہ انہوں نے عقل وسائنس کی توجیہات سے ٹکرانے والی احدیث کا انکار کر دیا۔

اس کے برعکس اہل کلام کا مطلق قول کہ خبر واحد ''ظن'' کا فائدہ دیتی ہے، یعنی جھوٹ اور سچ کے احتمال پر ہے، جس سے ان کی مراد ظن مجرد ہے، جس کا معنی یہ ہے خبر واحد از خود حجت نہیں... تو یہ قول پوری امت کے خلاف بدعت ٹھہرتا ہے۔ علامہ احمد محمد شاکر لکھتے ہیں "فقد ابتدع بعض المتقدمين بدعة سيئةهي عدم الاحتجاج بالأحاديث لأنها تسمى في اصطلاحات بعض الفنون"

"ظنية الثبوت"... کہ یہ بدعت سیئہ شروع سے اہل کلام کا مذہب رہی ہے جنہوں نے فنون کلام کی مرادوں پر احادیث کو ظنی الثبوت کہتے ہوئے حجیت سے نکال دیا... آپ نے کہا یہ محض لفظی اصطلاح کی پیروی ہے جس کا تاریخی قیمت میں کوئی مقام نہیں... آپ نے اس موقع پر شدید ردعمل ظاہر کیا ہے کہ جو لوگ حدیث کی صحت، تصدیق اور دلی اطمینان کے لئے متواتر ہونے کی شرط لگاتے ہیں وہ فئہ قلیلہ محصورۃ مغمورۃ ہیں یعنی اہل بدعت کی یہ جماعت جنہوں نے اس کھوٹے مذہب کی بنیاد قائم کی ہے یہ لوگ قلت سروسامانی کی وجہ سے کمزور اور علمی حلقہ میں بے اثر ہیں... آپ نے کہا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ احادیث میں صحت کا کوئی معیار نہیں، پھر وہ اپنی مرضی پر احادیث کو ثابت یا رد کرتے ہیں، یہ وہی ہیں جنہیں یورپ نے اپنی فیکٹری سے تیار کیا ہے، جو وہاں کے مستشرقین کو اپنا پیشوا مانتے ہیں، اور یہی مبشرین کے چھوڑے ہوئے جاسوس ہیں (دیکھئے الوسیط د. محمد ابوشہبہ ص ۷۹، ۸۰)

قارئین کرام، یہ بات بڑی سخت نظر آئے گی مگر آپ سوچیے اگر ہر حدیث کے بارہ میں یہ کہا جائے ہوسکتا ہے رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا یا ہوسکتا ہے رسول اللہ ﷺ نے کچھ اور کہا ہو، تو کیا اس تردد میں حدیث پر عمل کرنے کو جی چاہے گا؟... پھر کیا اس لاابالیت کو افراد امت برداشت کریں گے جنہیں حدیث پر عمل کرنے سے سکون، راحت بالی اور استقرار میسر آیا۔ جو نبوی صداقتوں کو مختلف شعبہ جات میں دیکھتے ہوئے آئے دن اپنا ایمان بڑھا رہے ہیں؟... غور کیجئے کافروں کو اس بات نے کچھ فائدہ نہ دیا جب انہوں نے کہا ''ان نظن الا ظنا ومانحن بمستيقنين'' کہ ہمیں اس قسم کے خیال تو آرہے ہیں اللہ کا وعدہ حق ہے، مگر یقین نہیں بن رہا۔ کافروں نے جب اللہ کے وعدہ کو ظن پر لیا تو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ قبر میں اہل یقین ثابت قدم رہیں گے اور منافق یا اپنے دین میں شک کرنے والا گھبرا جائے گا جواب نہیں دے پائے گا، تو ہم اہل کلام کے پیچھے اپنے دین کو ظن کی بنیاد پر کیسے لے سکتے ہیں؟ (خوب سمجھ لیجئے)

قارئین کرام: موضوع کا لب لباب دو قسم کے مقدمات پر جمع ہوتا ہے۔ ایک جسے اصلاحی صاحب

نے قائم کیا ہے کہ احادیث کی بنیاد ظن ہے، دوسرا سید عابدی کا قائم کردہ ہے کہ شریعت کی بنیاد خبر واحد پر ہے ،اگر دونوں کو صحیح کہیں تو واقعی زہر قاتل کا فساد لازم آئے گا کیونکہ منطقی نتیجہ یہی نکلے گا۔''لہذا ساری شریعت ظنی ہے''، جس پر فریقین میں سے کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ پس ایک مقدمہ کو غلط کہنا ضروری ہے، عابدی صاحب کی بات دراصل بعض محدثین کی بات ہے جنہوں نے متواتر احادیث کے وجود کی نفی کی ہے اور اسے بعض محققین نے لفظی متواتر خبروں کے مطابق صحیح کہا ہے....

باقی لکھنے کا مقصد وہی ہے جو علامہ اقبال نے بتایا تھا ؎

تلاطم ھائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

کہ حق کی تلاش میں نظریات کا ٹکراؤ امت کو جگاتا ہے، اور گوہر پیدا کرتا ہے یا انہیں علمی خوراک دیتا ہے۔ یہ بحث اگرچہ علمی انداز اختیار کرنے کی وجہ سے پیچیدہ اور مشکل ہوگئی ہے مگر اسے سمجھ لینے سے ان تفاصیل کا لب لباب پاسکتے ہیں جو اس میدان سے متعلق ہے جس کا فائدہ قانونی یا دستوری لحاظ سے بھی حاصل ہوگا، کہ نفاذ شریعت میں قرآن وسنت کے خالص نظام کا معنی کیا ہے جو فقہ مقارن (کہ کس مسئلہ میں کون کس کے ساتھ اکٹھا ہوسکتا ہے) اور محدثین کا منہج چاہتا ہے... اور شرعی مقاصد پر حکومت کی بنیاد رکھنے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے جب مکتبہ خاص کی فکر اور تقلید کو اختیار کرنا پیش نظر ہو....

اب ہم ڈاکٹر صاحب کے ترتیب کے مطابق ملاحظات پورا کرتے ہیں۔

تفاصیل

پہلا موقف: ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث کی صحت پا کر درایت کو اختیار کرنا چاہیے جہاں ''اہل حدیث اور شافعیہ صرف سند کو اہمیت دیتے ہیں جبکہ مالکیہ حنفیہ کے نزدیک سند کے ساتھ متن اور دیگر محرکات کا تجزیہ بھی بعض اوقات ضروری ہوتا ہے'' (روشنی 8 مئی 2009)

درست ہے کہ درایت کے عوامل یا محرکات سے متن کا تجزیہ کیا جانا چاہیے مگر کس منہج پر؟ دیکھئے درایت کا عمل دو لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔ مدلولات اور متقابلات سے:

مدلولات میں تو ظاہر ہے کہ جب ایک لفظ مختلف دلالتوں پر کئی معانی رکھتا ہے۔ تو جو کسی کو سمجھ آئے اسے

اختیار کرنے پر معذور بھی ہے اور ذمہ دار بھی، جھگڑا متقابلات سے شروع ہوتا ہے جہاں حدیث کو موضوع کی دیگر احادیث اور قواعد مذہب یا شروط ائمہ کے لحاظ سے پرکھا جاتا ہے وہاں منہج کا فرق یوں ہے:

محدثین کا طرز عمل:

محدثین کی عادت یہ ہے کہ جب کوئی مقبول حدیث دوسری مقبول حدیث سے تعارض پیدا کرے تو پہلے تعارض کو وجہ جمع کی صورت میں ختم کرتے ہیں۔ (وجہ جمع کا معنی یہ ہے کہ فقہ کے تمام اصول جو رائج اور متداول ہیں خواہ اہل رائے سے ہوں یا اہل کلام سے یا تجربہ، مشاہدہ، یا عرف وغیرہ سے... ان تمام پہلوؤں میں کوشش کی جائے کہ دونوں حدیثیں ایسے مطلب پر جمع ہو جائیں جہاں ہر ایک پر عمل ہو سکے)۔ اگر ممکن نہ ہو تو تاریخ سے ناسخ منسوخ کا پتہ لگاتے ہیں۔ نہ ہو سکے تو وجوہ ترجیح پر نظر رکھتے ہیں۔ اور اگر ہر لحاظ سے برابر ٹھہریں تو دونوں پر توقف (عمل سے رک جانا) اختیار کرتے ہیں بعض کہتے ہیں خود (اپنی رائے) سے ترجیح دی جائے۔ اور بعض کہتے ہیں ایک وقت تک ایک حدیث کے مطابق فتوی دیا جائے۔ دوسرے وقت میں دوسری کے مطابق.....

ان کے ہاں اس سلسلہ میں مزید کوئی شرط نہیں تاہم مشہور قول پہلا ہے کہ دونوں پر عمل نہ کیا جائے تاوقتیکہ طرق اور شواہد کی بنا پر کسی ایک حدیث کو دوسری پر ترجیح مل جائے تو راجح کو اختیار کیا جائے۔

فصل: ڈاکٹر برنی صاحب مولانا مودودی سے نقل کر رہے تھے کہ ''صرف ایک طریقے پر جامد ہونے کی بجائے وقتاً فوقتاً ان سارے طریقوں پر عمل کیا جائے تو یہ حدیث رسول ﷺ کی زیادہ بہتر پیروی ہو گی... الخ'' تو اس کا موقع اسی جگہ ہے نہ کہ تطبیقی مراحل سے پہلے، اسی طرح آپ نے شاہ صاحب سے نقل کیا: ''اصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث پر عمل کرے الا یہ کہ کسی مسئلہ میں سب حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے غیر ممکن ہو... الخ'' (۲۲ مئی کا شمارہ) اس بات کا تعلق چونکہ حدیث سے ہے تو یہ وہی بات ہے جو اہل علم ابن تیمیہ وغیرہ سے منقول ہے اور اسکا تعلق تناقض نہ ہونے کی صورت میں مقبول احادیث سے ہے کہ ہر حدیث پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے۔

وضاحت: اول موقف میں معنی یہ ہونگے کہ ''یہ بھی ٹھیک کہتا ہے، وہ بھی ٹھیک کہتا ہے'' جیسا کہ جماعت اسلامی سے یہ معلوم ہے..... تو یہ تب ہو سکتا ہے جب حدیثی تطبیق کے بعد اختلاف کی نوعیت معمولی نظر آئے تب دونوں

طریقے درست ہونگے مگر یہ ضابطہ مطلقاً صحیح نہیں، مصر میں اخوانیوں کی تحریک اسی نہج پر تھی حتیٰ کہ وہ شیعہ ازم کے قریب پہنچ گئے جس کے بعد شیعہ سنی اتحاد کے سلسلے میں قاہرہ میں ایک ادارہ ''دارالتقریب'' کے نام پر قائم کیا گیا...

اس فکر کو مطلقاً صحیح مان لینے سے سنت کے ساتھ مزاحمت پیدا ہوتی ہے، حق و باطل کا گڈمڈ ہونا لازم آتا ہے اور حق کمزور ہوتا ہے کیونکہ حق وحدت کا نام ہے تعدد کا نہیں۔ اسی سے وحدۃ الادیان فکر کی آبیاری ہوتی ہے۔ ہاں اگر دو یا زیادہ طریقے (تطبیقی مراحل گزر جانے کے بعد) اگر اختلافی نوعیت میں ہلکے پائے جائیں جیسے قنوت وتر، امام کے ساتھ ملنے والی رکعت، اور چار اکٹھی رکعت پڑھنا وغیرہ مسائل، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ نے وضاحت کی ہے کہ شریعت ایسے امور میں توسع اور آسانی کی گنجائش رکھتی ہے (جو حق کے دو ہو جانے کی بات نہیں بلکہ اس کی طبعی نوعیت کی بات ہے کہ وہ آسانی چاہتا ہے) اس موضوع پر جامع کام ابن رشد فلسفی کا ہے یا فقہ کے بجائے مشترکہ اصولوں پر ترتیب کا کام دکتور عبدالکریم النملہ نے انجام دیا ہے جیسا کہ ابن رشد نے فقہ پر کام کیا ہے۔ کہ کس مسئلہ میں، کس دلیل پر، ہم آپس میں مل سکتے ہیں، جسے اصطلاحاً ''فقہ مقارن'' یا علم اصول الفقہ المقارن کہا جاتا ہے۔

رہی بات شاہ صاحب کی تو وہ اپنی جگہ پر صحیح ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ''یہ حدیث بھی صحیح کہتی ہے وہ بھی صحیح کہتی ہے'' تو یہ وہی بات ہے جو ہم نے شیخ الاسلام سے نقل کی ہے اور اس پر اختلاف بھی کون کر سکتا ہے جب کہ دونوں طرف حدیث صحیح ہو؟! الغرض یہ دونوں قول تطبیقی مراحل سے تعلق رکھتے ہیں کہ پہلے تناقض پر غور کیا جائے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نکل کیا گیا۔ پھر دو طریقوں یا دونوں احادیث پر عمل کی کوئی شرعی وجہ نکلتی ہو، تب طریقہ یا حدیث کا عمل بدل لینے میں کوئی حرج نہیں۔

اب ڈاکٹر صاحب کا کہنا: ''محترم عابدی صاحب کا خیال ہے کہ محض سند کا مضبوط ہونا کافی ہے۔ اور حدیث کے متن کو پرکھنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ وہ بنیادی اختلاف ہے جو کئی صدیوں سے مسلم معاشرے میں چل رہا ہے اہل حدیث اور شافعیہ صرف سند.....الخ

تو اس کا معنی یہ ہے کہ محدثین صحیح حدیث ہونے کا جب فیصلہ کر لیتے ہیں تو ان کے نزدیک اس پر عمل واجب ہے، کیونکہ متن علتوں سے نکل چکا ہے، اب عملی صورتحال کیا ہوگی؟ تو یہ عمل کرتے وقت دیگر احادیث اور عقلی معارضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے طے ہوتا ہے بشرطیکہ ان کا تعلق بالذات اسی متن سے ہو (جیسا کہ ان کا

تعلیلی موقف ابھی آئے گا) اس کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ عمل کرتے وقت دیگر احادیث سامنے نہیں رکھتے، پھر آخر تطبیقی قواعد کا فائدہ کیا ہوگا؟ بلکہ عمل کے وقت الٹا فقہاء محتاج ہیں کہ باب سے متعلقہ تمام مرویات، راویوں کا اختلاف (وہم، شذوذ، اضطراب وغیرہ) پانے کے لئے محدثین سے رجوع کریں۔ سو یہ بات:

''اہل حدیث اور شافعیہ کے نزدیک حدیث کے متن کو پرکھنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی...''

اس کا موقع مخصوص تعلیلی یا معنوی وجوہ سے ہے جن کا تعلق بالذات اس متن سے نہیں ہوتا بلکہ عمومی قواعد یا مقررہ شروط سے ہوتا ہے جو بعض اوقات متن پر عمل کرنے سے روکتی ہیں جبکہ محدثین ان اصول وضوابط کو (جنکا تعلق تدوین حدیث یا علوم حدیث سے نہیں) صحیح حدیث کو پرکھنے کا معیار نہیں سمجھتے، کیونکہ قواعد یا شروط کے بانی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اصول شریعت سے ماخوذ ہیں، یہ کیسے جتا سکتے ہیں کہ اصول وقواعد مرتب کرتے ہوئے ہم نے ذخیرہ حدیث کے ہر متن کو سامنے رکھ لیا ہے جو بھی مستقبل میں ظاہر ہونے والا ہے؟! سو یہی وہ راز ہے جس بنا پر محدثین ان مذہبی اصول وقواعد کا صحیح حدیث پر استعمال: وحی پر عقل کو حاکم ٹھہرا دینے کی صورت سمجھتے ہیں۔ لہذا وہ نہیں مانیں گے ماسوائے ایک حالت کے جب کوئی دوسری مقبول حدیث معارض آجائے، تب عقلی، اصولی بحث کی طرف آنا چاہیں گے کیونکہ یہ وحی پر وحی سے فیصلہ ہے۔ یوں ان کے نزدیک لفظ ومعنی حدیث سے متعین ہوتے ہیں نہ کہ معنی عقل سے اور لفظ حدیث سے۔ (خوب سمجھ لیجئے)

* اگر حدیث سے صحابی کا قول، عمل، یا فتوی ٹکرائے تو وہ صحابی کی مخالفت کو کسی نہ کسی عذر پر محمول کرتے ہوئے حدیث کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ جیسا کہ یہ بیان اگلے موقف میں آرہا ہے۔
* اگر معقولات (عقل ورائے) سے ٹکرائے تو وہی پہلے تطبیقی وجوہ سے وجہ جمع کی صورت پیدا کرتے ہیں، نہ ہو سکے تو ظاہر حدیث کو لیں گے اور عقل کو چھوڑ دیں گے۔

ظاہر حدیث سے مراد: ہر بات کے چار مراتب ہوتے ہیں: اگر ایک ہی معنی رکھے تو ''نص'' ہوگی؛ اگر ایک سے زیادہ معنوں کا برابر سطح پر احتمال رکھے تو وہ ''مجمل'' ہوگی اور اگر ایک احتمال دوسرے سے قوی ہو تو قوی احتمال کو ''ظاہر'' اور ضعیف کو ''تاویل'' کہا جاتا ہے۔ اب تعارض کے وقت نص کا سوال نہیں، کیونکہ اس پر عموماً جھگڑا نہیں ہوتا، مجمل کا موقع نہیں کیونکہ وہ قابل عمل نہیں ہوتا جب تک جانب ترجیح کا پتہ نہ چل جائے۔ پس قوی احتمال ہی رہ جاتا ہے جسے وہ عقل پر ترجیح دیتے ہیں، اور یہ ان کے نزدیک آخری حل

ہے۔ جس بنا پر انہیں ظاہری کہنا بالکل صحیح ہے۔

اس کے مقابلہ میں اہل الرائے (امام ابوحنیفہ کے بعد ان کے شاگرد، اہل عراق: محمد بن حسن، قاضی ابو یوسف، زفر، حسن بن زیاد، ابن سماعیہ، عافیہ قاضی، ابو مطیع بلخی، بشر مریسی وغیرہ) چونکہ شریعت کی بنیاد مقاصد پر رکھتے ہیں تو وہ معانی اور مرادوں پر غور کرتے ہیں۔ پھر ہر حدیث کو اس کے مطابق پرکھتے ہیں۔ جہاں ان کے بعض اصول، ضوابط یا خاص شروط ہیں...... ان کا طریق کار امام محمد عبدہ (م 1905) بیان کرتے ہیں کہ اگر عقل ونقل میں تعارض نقل آئے تو تمام اہل ملت اسلامیہ اتفاق رکھتے ہیں۔ سوائے چند معدود افراد کے جو قابل توجہ نہیں۔ کہ اس وقت عقل کو لیا جائے گا اور نقل کو دو میں سے ایک طریقے پر اختیار کیا جائے:

۱) طریق تسلیم، کہ حدیث تو صحیح ہے مگر ہم سمجھنے سے قاصر ہیں، لہذا (عمل کرنے کی بجائے) واللہ اعلم کہہ دیا جائے۔

۲) لغوی قوانین کے مطابق نقل (حدیث وغیرہ) کی یوں تاویل کردی جائے کہ حدیث سے وہ مطلب لینا مراد ہو جائے جو عقل چاہتی ہے۔ (بحوالہ التفسیر العلمی للقرآن فی المیزان دکتور احمد عمر جبر ص 86)

الحرا

انٹرنیشنل (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ٹریولز اینڈ ٹورز

سالہا سال کی کامیاب خدمات کے تسلسل کے ساتھ، عمرہ 2010ء کی بکنگ جاری ہے

☆...... مناسب پیکج ریٹ، بہترین خدمات کے ساتھ ☆...... مناسب فاصلہ پر صاف ستھری رہائش

☆...... جدہ ائیرپورٹ سے جدہ ائیرپورٹ تک ٹرانسپورٹ (ڈبل عمرہ کے ساتھ)

☆...... گروپ کے ساتھ روانگی، مسنون راہنمائی

چیف ایگزیکٹو: اکرام الحق (فاضل مدینہ یونیورسٹی) 0321-5903002

آفس جاوید بلڈنگ متصل یو بی ایل (U.B.L) شاندار چوک جہلم

فون: 0544-405936 , 0544-720239 فیکس: 0544-620510